DEPARTMENT OF URDU

Langat Singh College, Muzaffarpur

NAAC Grade – 'A'

(A Constituent unit of B.R.A. Bihar University, Muzaffarpur)

DR. MUSTAFIZ AHAD
Assistant Professor
Mob- 9955722260, 9472079131

Email:- ahadmustafiz@gmail.com
lscollegeprincipal@gmail.com

Ref. No:……………….

Date :…………………….

B.A. Urdu (Hons) Part III

Paper VII

Topic :- Delhi aur Lakhnow men Shero Adab ka Irtequa

Ahad
2/7/20

ڈاکٹر مستفیض احد

دہلی اور لکھنؤ میں شعر و ادب کا ارتقا

دکن میں ایک اچھی خاصی مدت تک اردو پھلنے پھولنے اور ارتقا کے راستے طے کرتی ہوئی پہنچی ہے جب 18ویں صدی کے آغاز میں دہلی میں رونق افروز ہوتی ہے۔ اس وقت واقعتاً دہلی میں فارسی گوئی کا بول بالا ہے۔ ہندوستان ہی نہیں افغانستان اور ایران تک کے معروف فارسی شعرا ہندوستان کی سرزمین پر داد سخن دے رہے تھے۔ اس دور میں اردو اہل دہلی کے درمیان کہاں ہے، اس کی تلاش کے لیے تین اجزاء اہم ہیں (۱) دکنی شاعری کا دہلی پہنچنا (۲) فارسی گویوں کا اردو کی طرف منعطف ہونا اور (۳) ایہام گو شعرا کا منظر عام پر ابھرنا۔ یہ واقعات ایک ہی وقت میں، ایک ہی جغرافیائی ماحول میں ہو رہے ہیں۔ یہ کہنا ابھی مشکل ہے کہ ان تینوں کے درمیان کوئی باہمی تعلق ہے یا نہیں۔ قرائن واضح کرتے ہیں کہ ان کے بیچ کوئی رشتہ ہو سکتا ہے۔ تاریخ ادب کے طالب علم کو ان معاملات پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

عہد محمد شاہ میں سراج الدین علی خان آرزو اور مرزا عبدالقادر بیدل فارسی کے دو ایسے بڑے شاعر موجود ہیں جن کی اردو گوئی ثابت ہے۔ شاہ جہاں کے دور تک ابوالفضل، فیضی، عرفی، نظیری، صائب، قدسی اور کلیم جیسے شعرا دربار سے وابستہ تھے۔ اور مغلیہ سلطنت کے عروج کے ساتھ ان کی فارسی گوئی بھی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ لیکن اورنگ زیب کے ختم ہونے کے بعد فارسی کا زور گھٹنے لگا، یہی زمانہ ہے جب دہلی میں اس عوامی زبان کی طرف جھکاؤ بڑھا۔ جس کی واضح مثال آرزو اور بیدل ہیں۔ جن کے پاس ایسے شاگرد موجود تھے جو اردو گوئی کی طرف آنا چاہتے تھے۔ دہلی میں اردو شعرا کی پہلی نسل واقعتاً انہیں فارسی گو اساتذہ کی آغوش تربیت میں پلی ہوئی ہے۔ اٹھارہویں صدی عیسوی میں دہلی میں جن شعرا سے ہمارا سب سے پہلے تعارف ہوتا ہے، ان میں صف اول ایہام گو شعرا کی ہے۔ فارسی گوئی سے الگ ہونے کا یہ ایک لسانی تجربہ بھی ہے۔ شاید ان پر ولی متاثر ہوئے اور اس کا محرک نئے طور پر استعمال کرنے کا بھی الزام عائد ہو لیکن شاعری کو ایک لسانی کھیل تماشا بنانا اور پھر اس کے وسیلے سے اپنے عہد کی بوالعجبیوں کو پیش کر رہے تھے۔ فائز، آبرو، ناجی، یکرنگ، مضمون، فغاں، تاباں جیسے ایہام گو شعرا میں وہ خوش فکر ہیں جس سے نئی نسل متاثر ہو رہی تھی۔ ایہام گو لوگوں کا یہاں معاشرتی زوال کے اثرات سب سے زیادہ ہیں۔ ہندوستانی تہذیب جس بڑے پیمانے پر شکست و ریخت کا شکار ہو رہی تھی، اس دور کے شعرا اس سے الگ کوئی بات نہیں کر رہے تھے۔ بلکہ یوں کہ وہ شعرا جو گزشتہ دور میں دکنی تحریک کے زیر اثر تھے

طول و عرض میں پھیل چکے تھے، اب اس کا کوئی تازہ سلسلہ دہلی میں موجود نہیں تھا۔

تاریخ کے اس مرحلہ پر دہلی کی شاعری کی سب سے طاقتور نسل سامنے آتی ہے۔ ناقدین نے اسی زمانے کو اردو کا عہد زریں قرار دیا ہے۔ اس نسل کے پہلے دستے میں ایہام گویوں کی بزم سے الگ شاہ حاتم اور مرزا مظہر اور ان کے دوسرے شاگرد ہیں جنہوں نے اصلاح زبان کی تحریک کی داغ بیل ڈال کر ایک ایسا نیا سلسلہ چلایا جس سے ایہام گوئی دہلی سے تمام ہو گئی۔ اسی قبیل میں انعام اللہ خاں یقین جیسے نوجوان شاعر بھی شمار میں لائے جا سکتے ہیں۔ لیکن درد، میر، سودا، سوز، اور میر اثر جیسے شاعروں کی نسل نے دہلی میں اردو شاعری کے کاروان کو بہت وسعت اور بلندی بخشی۔ نظیر اکبرآبادی الگ سے دہلی میں اردو شاعری کے ماحول کو منفرد ذائقہ بخش رہے تھے۔ اردو شاعری کے اس عہد زریں کو ریاست اور سماج کی طرف سے کوئی تعاون نہیں تھا۔ سلطنت دہلی کے خاتمہ کے آثار واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ 18 ویں صدی میں آخری [illegible] شاہ عالم ثانی کا دور ہے جس کی بادشاہت کا علاقہ "از دہلی تا پالم" قرار دے کر لوگ مذاق اڑاتے تھے۔ ایسے میں اردو شاعروں اور ادیبوں کو حکومت سے کوئی معاونت نہیں مل رہی تھی۔

میر کی زندگی کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ لکھنؤ پہنچنے سے پہلے وہ دہلی اور اس کے مضافات میں مالی پریشانیوں کو دور کرنے کے مقصد سے کم از کم چھ دفعہ سفر کر چکے ہیں۔ اسی مرحلے میں لکھنؤ کے نوابین سامنے آتے ہیں۔ خاص طور پر شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کے زمانے میں فیض آباد اور لکھنؤ اردو داں حلقہ کیلئے ایک پرکشش مرکز بن جاتے ہیں۔ تلاش معاش میں شاعروں اور ادیبوں کو جائے اماں چاہیے اور اسی لئے دہلی سے بڑی تعداد میں لکھنے والے اودھ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

تاریخی اعتبار سے اودھ کی طرف رخ کرنے والے پہلے قابل ذکر شاعر فغاں ہیں۔ شجاع الدولہ کے زمانے میں ہی سودا، جعفر علی خاں حسرت، جیسے شاعر بھی فیض آباد پہنچ جاتے ہیں۔ میر ضاحک بھی سب سے پہلے اودھ آنے والوں میں گنے جاتے ہیں۔ آصف الدولہ کے زمانے میں 1781ء سے 1782ء تک میر بھی تلاش معاش میں لکھنؤ پہنچ چکے ہیں۔ انشاء اللہ خاں انشاء، مصحفی، اور میر حسن سب دہلی سے لکھنؤ میں موجود ہیں۔ لکھنؤ میں اردو شاعری کا پہلا دور انہیں دہلوی تارکین وطن سے شروع ہوتا ہے۔ تاریخ میں ہمارے پاس زیادہ اطلاع نہیں کہ ان شاعروں سے پہلے لکھنؤ میں اردو کی کون کون سی اہم ہستیاں تھیں۔ یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ ان میں سے اکثر شعراء لکھنؤ بڑھاپے میں آئے۔ اس وجہ سے ان لوگوں کی شاعری ایک خاص مقام تک پہنچ کر لسانی اور ادبی مزاج میں پختگی حاصل کر چکی تھی۔

لکھنوی شاعری کا واقعتاً دور دوم عروج سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس میں کم عمر کی دہلوی نسل آتی ہی،

بعض ایسے شاعر بھی ہیں جو دہلی کے عمومی مزاج سے الگ اپنا انداز رکھتے تھے - جرأت، انشا، مصحفی اور میر حسن ایسے شاعروں میں اولیت رکھتے ہیں جن سے لکھنؤ میں علاحدہ قسم کے شعری اسلوب کی بنیاد پڑی۔ جرأت بیان کی رنگینی اور معاملہ بندی اور میر حسن تہذیب کی پاسداری کی وجہ سے لکھنؤ میں دو علاحدہ انداز کی بنیاد رکھنے والے فن کار قرار پائے - اٹھارہویں صدی کے درمیانی عہد کو اس تناظر میں دیکھیں تو ناسخ اور آتش کی اہمیت سمجھ میں آتی ہے - ناسخ، مصحفی کے شاگرد ہیں، لیکن انہوں نے اپنے شاگردوں، خاص کر میر اوسط علی رشک کے ذریعے زبان کی ایک علاحدہ معیار سازی کی کوشش کی - لکھنؤ کے یہ دونوں اساتذہ حلقۂ شاگرداں کے معاملے میں بے حد خوش نصیب ہیں - ان لوگوں نے دہلی سے الگ زبان کے سانچے کو تیار کرنے کا ایک سلسلہ شروع کیا - آتش کے شاگردوں میں دیا شنکر نسیم کی مثنوی، "گلزار نسیم" کے علاوہ کوئی بڑا کارنامہ دکھائی نہیں دیتا - ناسخ اور ان کے شاگردوں نے قواعد اور محاورہ پر جتنا وقت لگایا، اس کے حساب سے تخلیقات کی طرف ان کی توجہ نہیں رہی۔

اسی زمانے میں لکھنؤ میں مرثیوں کا بھی بڑا فروغ ہوا - میر ضمیر اور خلیق نے جس چراغ کو روشن کیا تھا، اسے ان کے بعد کی نسل نے آفتاب بنا دیا - انیس اور دبیر کا دور اردو شاعری کی تاریخ کا ایک اہم موڑ ہے - لکھنؤ میں مثنویوں کے ارتقا کو جس طرح مرثیوں کا فروغ ہوا وہ اردو شاعری کا علاحدہ باب ہے - دہلی کی بزم میں اردو نثر کی طرف کم توجہ تھی، لیکن اہالیان لکھنؤ نے داستان نویسی کو آزمانے کی کوشش کی - "نوطرز مرصع" (عطا حسین خاں تحسین) "فسانۂ عجائب"، "سرور عشق" اور "شگوفۂ محبت" (رجب علی بیگ سرور) اور "بوستان حکمت" (فقیر محمد گویا) اسی عہد کے اہم قصے ہیں - "رانی کیتکی کی کہانی" اور "دریائے لطافت" بھی (انشاء اللہ خاں انشا) اسی خاک سے برآمد ہوئیں - فورٹ ولیم کالج کے مصنفین میر شیر علی افسوس اور مرزا علی لطف لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔

اردو کی ادبی تاریخ میں پرانی تنقید کے حوالے سے دہلی اور لکھنؤ کے مراکز کے زیر اثر لکھے گئے ادب کو بعض اوقات ایک دوسرے کے مقابلے کھڑا کیا گیا اور اسی سے دبستانی اختلافات کا فروغ ہوا - رفتہ رفتہ ان اختلافات نے ایسی بنیادی شکل اختیار کر لی جس میں ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کا ایک غیر ادبی شاخسانہ تھا یہ زخم ایسا ناسور بنا کہ دہلی اور لکھنؤ کی اردو کو بالکل الگ قسم کا تسلیم کیا جانے لگا یا کم سے کم یہ کوشش ضرور ہوئی کہ دونوں مقامات کی تخلیقات میں بہت زیادہ فرق ہے - یہ صحیح ہے کہ دہلی کی طرح سے ادب کی کوئی طویل روایت لکھنؤ میں موجود نہیں تھی - اٹھارہویں صدی کے اواخر سے پہلے لکھنؤ کی ادبی تاریخ میں کوئی بڑی تخلیقی شخصیت

دکھائی نہیں دیتی۔ لیکن دہلی کی اجڑتی بزم کے سامنے لکھنؤ کی چہکتی فضاؤں کی اہمیت زیادہ ہو گئی تھی۔ اسی لئے اہل لکھنؤ کے ذہن میں کہیں یہ بات آئی کہ جب ہوا کا رخ ہماری طرف ہے تو کیوں نہ خود کو شاعری کا ایک علاحدہ باب قرار دیا جائے۔ یہ سلسلہ اچھے علمی پیمانے پر اردو سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ اس جذبہ کو تفاخر کی غیر شعوری کہنا، انصاف کا تقاضا نہیں ہے۔ اور اسی طرح دبستان لکھنؤ کا آزادانہ وجود قائم ہوا۔

اہل لکھنؤ نے دہلی اور لکھنؤ کے شاعروں کے کلام سے زبان و بیان کے استعمال کے بعض امتیازات کی تشہیر کی۔ زیر بحث یہ نکتہ حاصل کرتی ہے۔ بعض الفاظ جس پر اہل دہلی جنس کے تعلق سے بحث کرتے تھے اور مذکر و مؤنث دونوں طور پر استعمال کرتے تھے۔ انہیں لکھنؤ والوں نے اس طور پر استعمال کرنے کی کوشش کی جن پر اکثریت اہل دہلی کی کار بند نہیں تھی۔ ایسے الفاظ کی فہرست خاصی طویل ہے۔ مثلاً بلبل، طرز، سانس، رتھ، اسی طرح تلفظ کے معاملے میں بھی دہلی سے بالارادہ الگ انداز اپنانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن یہ تمام الفاظ ویسے ہی تھے جو اہل دہلی کے یہاں بھی استعمال میں دونوں طرح سے آتے تھے۔ اس طرح کہنا چاہئے کہ لفظوں کی سطح پر لکھنؤ اور دہلی کے جس فرق کو بڑھا چڑھا کر دکھایا گیا، وہ حقیقتاً ویسا نہیں تھا۔

ناسخ اور ان کے شاگردوں نے لکھنؤ میں اصلاح زبان کا کام اپنے ہاتھوں میں لیا اور اردو میں متروکات کی ایک طویل فہرست جاری کی۔ ہندوی سے گریز اور فارسیت کی طرف التفات کرنے کے دور میں، لکھنؤ کی روش نئی زبان کا نقطۂ امتیاز تھا۔ بلا شبہ لکھنؤ کے حلقے میں یہ نئی زبان نافذ ہوئی۔ لیکن اس بات کو دہلی سے جس طرح مخالف سمت کا معاملہ سمجھا جاتا ہے، ویسا ہرگز نہیں۔ ناسخ سے تین چوتھائی صدی پہلے دہلی میں مرزا مظہر جان جاناں اور ان کے شاگردوں نے ایہام گوئی کے خلاف تحریک چلائی، اس کے اغراض و مقاصد بھی ہندویت سے گریز اور فارسیت کی طرف جھکاؤ سے الگ کیسے تھے؟ دہلی میں بھی متروکات کی ایک فہرست جاری کی گئی تھی۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لکھنؤ اور دہلی دونوں جگہ ایک ہی طرح کی اصلاح زبان کی تحریک چلی۔ اتفاق سے دونوں کے نتائج یکساں رہے۔ ان تحریکوں نے اس لسانی منشور پر کچھ خاص توجہ دی اور اسی وجہ سے ان دونوں اصلاح زبان کی تحریکوں سے کوئی ناقد اور ادبی شخصیت نہیں پیدا ہوئی۔ میر اور درد، مرزا مظہر جان جاناں سے الگ رہے، اور آتش یا دیا شنکر نسیم حلقۂ ناسخ سے علاحدہ رہے۔

لکھنؤ اور دہلی کی شاعری میں ایک اور بنیادی فرق داخلیت اور خارجیت کا بتایا جاتا ہے۔ عمومیت پسند قدیم ناقدین نے بتایا کہ دہلی کی شاعری میں داخلیت ہے اور لکھنؤ کی شاعری میں

P.T.O

خارجیت ہے۔ اس کی ایک اور وجہ یہ بھی معلوم ہے کہ دہلی کی فضاؤں میں اہل تصوف کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ اس کے برخلاف لکھنؤ کے ماحول میں عیش پسندی اور دولت کی فراوانی تھی۔ دونوں دبستانوں کی شاعری میں بالعموم یہ فرق ہے۔ لیکن دونوں جگہ کے اچھے شاعروں میں فرق کی دوری کم ہے۔ لوگ بھی خارجیت اور داخلیت کو جتنی آسانی سے بالکل الگ مان لیا جاتا ہے، در اصل ان کا اس طرح علاحدہ وجود نہیں ہوتا ہے۔ داخل اور خارج کا ایک گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ لکھنؤ کے شعراء جن پر خارجیت کی تہمت ہے، نے بھی عشق و عاشقی کے گہرے تجربے بیان کئے ہیں۔ اس کی کئی مثالیں ہے جنہیں داخلیت ہی نہیں، متصوفانہ کیفیت والے بھی پسند آتی ہے۔ اردو کی صوفیانہ شاعری میں آتش کو ایک منفرد مقام دیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے مقابلے دہلی میں تمام ادبا کو اور ان سے لدے جعفر علی حسرت جیسے شعراء موجود تھے، ایسے ہی خارجیت اور داخلیت کو بنیادی خصوصیت مانتے ہوئے لکھنؤ اور دہلی اسکولوں کو کیسے الگ کیا جا سکتا ہے۔ جب شاعر کی نگاہ جتنی گہری ہوگی وہ اسی قدر موضوع کو شعر بدن میں اندر تک جائے گا۔ یہی خارج یا کائنات سے داخل اور باطن کا سفر ہے۔ اور اس میں دہلی اور لکھنؤ کا فرق بے معنی سا ہے۔

حلقہ لکھنؤ سے تعلق رکھنے والے علی جواد زیدی نے "دو ادبی اسکول" کتاب لکھ کر ہزاروں مغالطے فراہم کیے اور کہا کہ یہ نام نہاد اسکول ہیں۔ اور دہلی سے لکھنؤ کے بیچ ادب دوری اتنی کبھی نہیں رہی جس قدر وہ دکھائی جاتی ہے۔ یہ ماننا سب سے زیادہ صحیح ہوگا کہ دہلی اور لکھنؤ کی تاریخ ادب کے پیرائے ہیں۔ لیکن ادب کا سلسلہ خیال اس سے پہلے سے بھی چلتا رہا ہے اور اس کے بعد بھی چلتا رہے گا۔ دو مقامات اور تاریخوں کے درمیان جو فرق ہوتے ہیں، وہ بنیادی نوعیت کے کم ہوتے ہیں۔ انفرادی معاملے میں فرق فطری ہے۔ لکھنؤ اور دہلی دبستانوں کا تنازعہ اسی نقطۂ نظر سے حل کیا جا سکتا ہے۔

Mahad
21/6/20